بحث ونظر

ایک سورہ کی تفسیر پر کچھ معروضات

جناب نور الٰہی صاحب ایڈووکیٹ، گجرات

مئی ۱۹۸۶ء کے ترجمان القرآن میں پروفیسر آسی ضیائی صاحب نے سورۃ العصر کی تفسیر پر کچھ اشکالات پیش کیے ہیں اور لکھا ہے کہ مفسرین اس سورۃ کی جس طرح تشریح کرتے رہے ہیں، اس سے ان کا شرح صدر نہ ہو سکا، چنانچہ انہوں نے اپنی رائے سے ایک نئی تفسیر پیش کی ہے اور اس خواہش کا اظہار فرمایا ہے کہ اہل علم ان کے نقطہ نظر کی توثیق کریں۔

میں نے یہ مضمون ایک طالب علم کی حیثیت سے پڑھا ہے۔ اس میں درج ذیل امور محل نظر ہیں:

۱۔ پروفیسر صاحب نے اس سورۃ کے نزول کا پس منظر اس طرح بیان کیا ہے کہ ابتدائی مکی دور میں جب مٹھی بھر ایمان لانے والے آزمائشوں میں گھرے تھے ..... اس وقت اس معاشرے کے کھاتے پیتے لوگوں ..... نے طنزاً یا ازراہ ہمدردی ان سے کہا ہوگا کہ تم کیوں خود کو مصیبت میں ڈالتے ہو ..... دیکھو زمانہ گواہی دے رہا ہے کہ تم خسارے کا سودا کر رہے ہو ..... اس طرح کی باتیں سنتے سنتے مسلمانوں کو بھی اپنے مستقبل کے بارے میں کچھ اضطراب قدرتاً ہوا ہوگا اور نہ بھی ہوا ہو گا تو کم از کم ان باتوں کا جواب تو ظاہر ہے ان کے پاس کچھ نہ تھا۔ ایسے حالات میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ مختصراً اور بلیغ جواب دیا گیا کہ زمانہ تو پوری نوع انسانی کے خسارے کی گواہی دے رہا ہے۔ یہ شان نزول پروفیسر صاحب کے اپنے ذہن کی اختراع ہے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی تفسیر فتح العزیز میں فرماتے ہیں:

"سبب نزول ایں سورہ آنست کہ کلدہ بن اسید کہ اورا ابوالاسید نیز گویند کافرے بود کہ با امیرالمومنین حضرت ابوبکر صدیق رضہ در عہد جاہلیت ہم صحبت بود۔ بعد از اسلام حضرت ابوبکر صدیق رضہ روزے بایشاں درخورد و گفت کہ یا ابابکر ہمیشہ از زیرکی و ہوشیاری در تجارت و سوداگری سود مند می شدی۔ حالا ترا چہ شد کہ یک بارہ بایں مرتبہ زیاں کار گشتی کہ دین پدر خود را گذاشتی و از عبادات لات و عزیٰ محروم ماندی و از شفاعت ایشاں نا امید شدی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضہ در جواب آں ناداں فرمود کہ ہر کہ حق را قبول کند و کار نیک پیش گیرد زیاں زدہ نمی شود۔ حق تعالیٰ در بیان ایں مقادلہ تصویب مقولہ حضرت ابوبکر صدیق رضہ ایں سورۃ نازل فرمود[1]"

ترجمہ:۔ اس سورت کے نزول کا سبب یہ ہے کہ کلدہ بن اسید جسے ابوالاسید بھی کہتے ہیں۔ ایک کافر تھا۔ زمانہ جاہلیت میں حضرت ابوبکر رضہ کے ساتھ اس کے دوستانہ روابط تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضہ کے اسلام قبول کرنے کے بعد یہ شخص آپ سے ملا اور کہا: اے ابابکر! تم بڑے عقلمند اور ہوش مند تاجر ہو اور اپنی تجارت میں ہمیشہ فائدہ حاصل کرتے رہے ہو۔ اب تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ تم نے یک لخت اپنی شخصیت کو گرا کر خسارے کا سودا کیا اور اپنے باپ دادا کا دین ترک کر دیا، لات و عزیٰ کی عبادت چھوڑ دی اور ان کی شفاعت سے ناامید ہو گئے ہو۔ حضرت ابوبکر صدیق رضہ نے اپنے نادان دوست کو جواب دیتے ہوئے فرمایا: "جو شخص حق کو قبول کر کے نکوکاری اختیار کرے وہ خائب و خاسر نہیں ہے۔ یہ سورۃ نازل فرما کر اللہ تعالیٰ نے اس مکالمہ میں حضرت ابوبکر صدیق رضہ کے قول کو صائب قرار دیا ہے۔

پروفیسر صاحب کی اختراع اور اس سورہ کے واقعی سبب نزول کا فرق اہل علم پر واضح ہے۔ پروفیسر صاحب اس بات کے مدعی ہیں کہ کفار کے طعنوں کا جواب مسلمانوں کے پاس کچھ نہ تھا، لیکن حضرت ابوبکر رضہ نے اپنے نادان کافر دوست کو جو جواب دیا۔ اس سے پروفیسر صاحب کے بیان کی تردید ہو جاتی ہے۔

[1] تفسیر عزیزی پارہ عم ص ۲۰۴-۲۰۵۔ مطبع مجتبائی دہلی ایڈیشن ۱۹۲۹ء

۲ — پروفیسر صاحب نے خسر (خسارے) کو اس عارضی زندگی تک محدود رکھا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک حقیقی خسارہ آخرت کا خسارہ ہے اور حقیقی کامیابی آخرت کی کامیابی ہے۔ قرآن مجید میں اس مضمون کی حامل متعدد آیات ہیں۔ مثلاً :-

ا — "اسلام کے سوا جو شخص کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہے اُس کا وہ طریقہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔ اور آخرت میں وہ خسارہ پانے والوں میں سے ہوگا۔" (آل عمران: ۸۵)

ب — "اور جو کسی نے ایمان کی روش پر چلنے سے انکار کیا۔ اس کا سارا کارنامۂ زندگی ضائع ہو جائے گا۔ اور وہ آخرت میں خاسرین میں سے ہوگا۔" (المائدہ: ۵)

ج — "بے شک خسارہ اُٹھانے والے تو وہ ہیں جنہوں نے قیامت کے دن اپنے آپ کو اور اپنے آپ کو خسارے میں ڈالا۔" (الشوریٰ: ۴۵)

د — یہی ہیں جنہوں نے اپنے تئیں خسارے میں ڈالا اور جو کچھ وہ افترا کیا کرتے تھے ان سے جاتا رہا۔ بلاشبہ یہ لوگ آخرت میں سب سے زیادہ نقصان پانے والے (اخسرون) ہیں۔" (ہود: ۲۱-۲۲)

ہ — "یہی لوگ ہیں جن کے لیے بڑا عذاب ہے اور وہ آخرت میں بہت نقصان اُٹھانے والے (اخسرون) ہیں۔" (النمل: ۵)

و — "اور سن رکھو کہ شیطان کا لشکر نقصان اُٹھانے والا ہے۔" (المجادلہ: ۱۹)

ز — "اُس وقت جن کے پلڑے بھاری ہوں گے وہ فلاح پائیں گے اور جن کے پلڑے ہلکے ہوں گے وہی لوگ ہوں گے جنہوں نے اپنے تئیں خسارے میں ڈالا۔ وہ جہنم میں ہمیشہ رہیں گے۔" (المومنون: ۱۰۲-۱۰۳)

ح — "حضرت شعیبؑ کی قوم میں سے سردار لوگ جو کافر تھے، اُنہوں نے اپنے بھائیوں سے کہا کہ اگر تم نے شعیب کی پیروی کی تو تم خسارے میں پڑ جاؤ گے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان پر عذاب نازل کیا اور فرمایا کہ جنہوں نے شعیب کو جھٹلایا وہ خسارے میں پڑ گئے۔"

(الاعراف: ۹۰ تا ۹۲)

پروفیسر صاحب سے استدعا ہے کہ وہ ان آیات پر غور فرمائیں۔ اگر خسارے کو اس عارضی دنیاوی

زندگی تک محدود نہ کیا جائے تو مفسرین کرام نے اس سورہ کی جو تفسیر بیان کی ہے، اس میں کوئی اشکال نہیں ہے۔

۳۔۔ پروفیسر صاحب نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ آخرت میں زمانہ (العصر) کا وجود ہی نہ ہوگا۔ حالانکہ تخلیقِ آدم سے قبل بھی زمانہ کا تصور تھا۔ اور زمانہ آخرت کا بھی احاطہ کیے ہوئے ہے۔ فرمایا گیا:

ا۔۔ بے شک انسان پر زمانے میں ایک ایسا وقت بھی آچکا ہے کہ وہ کوئی قابلِ ذکر چیز نہ تھا۔ (الدہر۔ ۱)

ب۔۔ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، چھ دن میں پیدا کیا۔ (الفرقان ۔ ۵۹)

آخرت کے متعلق قرآن مجید میں جابجا، یوم الدین، الیوم الآخر، یوم القیامہ، یوم الفصل، یوم التغابن، الیوم الموعود، یوم الجمع، یوم البعث، یوم الحساب، یوم الخلود وغیرہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ تمہارے پروردگار کے نزدیک ایک روز تمہارے حساب کے رُو سے ہزار برس کے برابر ہے۔ (الحج ۔ ۲۲) ۔ آلِ فرعون کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ عالمِ برزخ میں وہ صبح و شام آگ کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں۔ (سورۃ المومن ۔ ۴۵ ۔ ۴۶) ۔ یہ صبح و شام اور دنوں اور سالوں کا شمار ظاہر کرتا ہے کہ زمانہ عالمِ برزخ اور عالمِ آخرت کو بھی محیط ہے۔ آخرت کو یوم الدین (روزِ جزا) اور یوم الفصل (فیصلے کا دن) فرمایا گیا ہے (الصافات ۔ ۲۰ ۔ ۲۱) کیونکہ عالمِ آخرت ہی میں آخری فیصلہ ہوگا کہ کون لوگ فلاح پانے والے ہیں اور کون نقصان اُٹھانے والے ہیں۔ اس دن کو اللہ تعالیٰ نے یوم التغابن یعنی سود و زیاں کا دن فرمایا ہے (ملاحظہ ہو سورۃ التغابن آیت ۹ ۔ ۱۰)

آخر میں پروفیسر صاحب سے میری گذارش ہے کہ وہ مولانا حمید الدین فراہیؒ کی تفسیر بھی دیکھیں۔ مولانا مرحوم نے "زمانہ کی قسم کیوں کھائی؟" کے زیرِ عنوان تحریر فرمایا ہے:۔

"پچھلی قوموں پر اللہ تعالیٰ کے جو فیصلے نافذ ہوئے وہ ٹھیک اُن کے اعمال کا بدلہ تھے۔ اگر انہوں نے نیکیاں اور بھلائیاں کیں تو خدا نے اُن کو عروج و کمال بخشا۔ اگر انہوں نے ظلم و فساد کی راہ اختیار کی تو قانونِ الٰہی نے اُن کو تباہ و برباد کر دیا۔ ان ہی حقائق کو یاد دلانے کے لیے خدا نے زمانہ کی قسم کھائی کہ لوگ یاد رکھیں کہ ایک دن اعمال کی اس حقیقت

سے لازماً اُن کو بھی دوچار ہونا ہے۔

"پھر زمانہ کی قسم میں ایک اور نازک نکتہ بھی مضمر ہے وہ یہ کہ انسان کا اصل راس المال زمانہ ہی ہے اور اس کا حال یہ ہے کہ تیز روی اور برق رفتاری میں کوئی چیز بھی اس سے بڑھ کر نہیں، لیکن یہ انسان کی کیسی نادانی ہے کہ وہ زمانہ کی اس بے وفائی سے واقف ہونے کے باوجود اس پر بھروسہ کرتا ہے اور اپنی زندگی کی بے ثباتی، روزِ قیامت کی باز پرس اور جزائے اعمال کے قانون سے بالکل غافل ہے .....

"علاوہ ازیں زمانہ کی تیز روی میں ایک پہلو بشارت اور تقویتِ صبر کا بھی ہے۔ کیونکہ اس تھوڑی سی گذر جانے والی مدت کے صلہ میں اگر انسان چاہے تو اجر و ثواب کا ایک لازوال خزانہ حاصل کر سکتا ہے۔ ایک بدبخت انسان اس حیاتِ چند روزہ کی فانی لذتوں پر ریجھ کر ابدی مسرت و کامیابی سے محروم ہو جاتا ہے، لیکن ایک عاقل اس فانی زندگی کے چند دنوں کے اندر جن کی حقیقت ایک خواب یا برق خاطف سے زیادہ نہیں۔ تقویٰ اور ضبطِ نفس کی آزمائشیں جھیل کر اور اس فنا ہو جانے والے باطل اور اس باقی رہنے والے حق پہ ثابت قدم رہ کر، جو آنکھوں سے اوجھل ہے، خدا کی خوشنودی اور اس کی محبت کا ابدی تخت و تاج حاصل لیتا ہے۔"[1]

اُمید ہے کہ پروفیسر صاحب میری ان معروضات کی روشنی میں اپنے استدلال پر نظرِ ثانی فرمائیں گے

ایک سورہ کی تفسیر پر کچھ معروضات

(۲)

نعیم صدیقی

ہمارے معزز و بزرگ دانش ور دوست پرنسپل (ریٹائرڈ) آسی ضیائی صاحب نے ایک

---

[1] مجموعہ تفاسیر فراہیؒ۔ صفحہ ۴۸۱ - ۴۸۲ -

سورہ (سورۂ عصر) پر کچھ "معروضات" پیش کی ہیں۔ ان کو اب تک کی تفاسیر سے اس کا مفہوم سمجھنے میں کامیابی (اور حصولِ اطمینان) نہیں ہوا۔ اُن کا خلاصۂ مطالعہ و تحقیق یہ ہے:

۱۔ تمام انسان (اچھے یا بُرے) بہت بڑے خسارے میں ہیں۔

۲۔ ایک دفعہ یہ خسارہ سب پر نافذ ہو جائے گا۔ اس سے کوئی مستثنیٰ نہیں۔

۳۔ یہ خسارہ موت ہے اور موت کو لازماً خسارہ ہی سمجھا جا سکتا ہے۔

۴۔ موت کے بعد "اِلّا" کا استثنائی بیان نتیجہ دکھائے گا۔ یعنی خسارہ واقع ہونے کے بعد۔ "اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ" کی صفات رکھنے والوں کو حالتِ خسران سے نکال کر اچھے حالات دیئے جائیں گے۔

۵۔ ضیائی صاحب کا خیال ہے کہ اگر اس سلسلۂ استدلال کو نہ مانا جائے تو قانونِ عروج و زوال کا جو تصور حاصل ہوتا ہے اس کے تحت ستم رسیدہ، آفات چشیدہ اور آلام کشیدہ مسلمانوں کا اخلاقی موقف مضبوط نہیں رہتا۔

میں اس خلاصۂ بحث کو سامنے رکھ کر کچھ نکات کو قابلِ غور سمجھتا ہوں:

ایک یہ کہ حرفِ استثناء اِلّا کے استعمال کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ پہلے تو بیان کردہ نوع یا گروہ کے تمام کے تمام افراد خسارے سے دوچار ہو جائیں گے اور اس میں نیک و بد کی کوئی تمیز نہ ہوگی۔ بعد میں اِلّا کے اقتضا کے تحت ایک جز کو خسران سے نکال کر فلاح و نجاح سے سرفراز کر دیا جائے گا۔

بلکہ عربی زبان میں "اِلّا" مجموعی حکم کی زد میں آنے والی صف سے مستثنیٰ افراد کو پہلے ہی سے الگ نکال دیتا ہے۔

سورۂ عصر والے معنوں ہی میں "اِلّا" کا ایک استعمال سورۂ "تین" میں ہے۔ اس میں پہلی اصولی بات یہ آئی ہے کہ "لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ"۔ دوسری یہ کہ "ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ" - "پھر ہم نے اُسے (اپنے قوانین کے تحت) اسفل سافلین میں گرا دیا۔ یہاں مغالطہ ہو سکتا ہے کہ سارے ہی انسانوں کے ساتھ یہ معاملہ ہوا۔ جی نہیں، آگے "اِلّا" کا حرفِ استثنیٰ موجود ہے، یعنی متذکرہ حکم یا فیصلے یا حالت سے انسانوں کے ایک حصے کو بچا لیا گیا ہے، ملاحظہ

فرمایہ "اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ" یعنی ایمان اور عمل صالح کی صفات جن لوگوں نے پیدا کر لیں وہ اسفل سافلین کے مقام تک گرنے سے محفوظ ہیں[1]۔ سورۂ عصر میں بھی یہ الفاظ ہیں: "اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" اور مزید یہ کہ "وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ" آپس میں حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرنا سورۂ تین میں محذوف ہے، کیونکہ ایمان و عملِ صالح کے ساتھ یہ خوبیاں از خود پائی جاتی ہیں۔ کسی نبیؑ یا پیرو نبی کی دعوت پر جو شخص ایمان لایا ہو اُس نے اس دعوت کو پھیلانے کا سبق تو سیکھ ہی لیا۔

سورۂ حجر میں ہے:

قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِیْنَ ۝ اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ ؕ اِنَّا لَمُنَجُّوْهُمْ اَجْمَعِیْنَ ۝ اِلَّا امْرَاَتَهٗ قَدَّرْنَآ ۙ اِنَّهَا لَمِنَ الْغٰبِرِیْنَ۔

یعنی حضرت لوط علیہ السلام سے فرشتے کہتے ہیں کہ ہم تو مجرمین کی قوم (کی خبر لینے کے لیے) بھیجے گئے ہیں سب ماسوائے آلِ لوطؑ کے (یعنی ان پر ایمان لانے والے اقربا و رفقا)۔ لیکن پھر استثناء در استثناء آتا ہے کہ آلِ لوطؑ کو مستثنیٰ کرنے کے معنی یہ نہیں کہ امراۃِ لوط بھی بچ نکلے گی۔ نہیں اس کا معاملہ بھی طے ہے، وہ بھی بچ نکلنے والے گروہ میں سے نہیں ہوگی، پیچھے رہ جانے والوں میں ہوگی۔

اب یہاں یہ مطلب نہیں کہ پہلے ساری قومِ لوط مع آلِ لوط کو ہدف بنا لیا جائے گا۔ پھر بعد میں آلِ لوط کو نکال کر زندگی دے دی جائے گی اور پھر ان میں سے امراۃ لوطؑ کو الگ لے جا کر نشانۂ عذاب بنایا جائے گا۔

میری دوسری گذارش یہ ہے کہ نہ ہر موت یکساں ہوتی ہے اور نہ لازمی طور پر موت خسارے دار

---

[1] اسفل سافلین میں گرنے کا مفہوم یہ ہے کہ آدمی ایمان و اخلاق سے کلیتاً عاری ہو کر بندۂ نفس بنے۔ اور پہلے انسانی شرف سے محروم ہو کر حیوانی سطح پر آئے اور پھر حیوانی سطح سے بھی گر کر شیطانی پستی تک گر جائے۔ ظاہر ہے کہ ایمان اور عملِ صالح سے آراستہ لوگ ان ساری پستیوں سے محفوظ ہیں۔

یا شرمناک ہوتی ہے۔ کبھی موت باعثِ ذلت اور کبھی سرمایۂ فخر ہوتی ہے۔ آخرت کے لحاظ سے بھی موت تو ایک دروازہ ہے جس میں داخل ہو کر مجرم ایک طرح کے حالات سے دوچار ہوتا ہے اور محسن دوسری طرح کے حالات سے۔

آیئے موت کی دونوں قسموں کا حال قرآن سے معلوم کریں۔ نکالیے سورۃ النحل!

۱۔ اَلَّذِیْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِیْٓ اَنْفُسِهِمْ ۠ فَاَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ ؕ بَلٰٓى اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ فَادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا۔

۲۔ اَلَّذِیْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَیِّبِیْنَ ۙ یَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَیْكُمُ ۙ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝

پہلی صورت میں اپنے نفسوں پر ظلم کرنے والوں کی طرف فرشتے آتے ہیں تو وہ بڑھ بڑھ کر عاجزی سے سلام مارتے ہیں کہ ہم تو برائی کرنے والے نہیں تھے۔ اور فرشتے کہتے ہیں، کیوں نہیں، اللہ خوب جاننے والا ہے اس کا جس پر تم عمل کرتے رہے ہو۔ پس جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ، اس میں ہمیشہ رہنے کے لیے۔

دوسری صورت میں فرشتے پاک صاف لوگوں کی جان لینے آتے ہیں تو انہیں وہ خود سلام کہتے ہیں۔ اور خوش خبری دیتے ہیں کہ سیدھے جنت میں داخل ہو جاؤ، ان اعمال کے بدلے میں جو تم کرتے رہے۔

بلکہ اولیں قسم کی "بدموتی" کی تو اور بھی تصویریں موجود ہیں۔ خصوصاً سورۃ الانعام (آیت ۹۳)

"اور کاش تو دیکھے جب ظالم لوگ موت کی سختیوں کی لپیٹ میں ہوتے ہیں اور فرشتے ہاتھ لمبے کر کے انہیں کہتے ہیں کہ اپنی جانیں نکال کر ہمارے حوالے کرو۔ آج کے دن تم کو ذلت کا عذاب اس جرم کی سزا کے طور پر ملے گا کہ تم جھوٹی باتیں اللہ کے ذمے لگاتے تھے۔ اور اس کی آیتوں سے متکبرانہ اعراض کرتے تھے۔"

بخلاف اس کے آپ کو ان موتوں کا علم ہے جن کو شوق سے پرستارانِ حق نے لبیک کہا۔ مکہ کا میدانِ تنعیم ہو یا مدینہ کے بدر و احد، کہاں کہاں سرفروشانِ دین خاک و خون میں دلی مسرتوں

کے ساتھ لوٹ نہیں گئے۔

بسا اوقات اچھے اور بُرے لوگوں کی موتیں اور ان کے جنازے قدرتِ حق کی خاص علامات بن جاتے رہے ہیں۔

موت خسران اس کے لیے ہے جس کے پاس موت کے بعد کی زندگی کے لیے عقیدہ و عمل اور دعوت و جہاد کا کوئی سرمایہ نہیں ہے جس کے پاس آخرت کے لیے اندوختہ ہے اس کے لیے تو موت صرف ایک آڑ ہے اس دُنیا اور دوسری دُنیا کے درمیان جسے عبور کرنا ہے — اچھا آدمی خوشی سے عبور کرے گا۔ اور بُرا آدمی پریشان و ملول ہو کر۔

اصل میں گفتگو کا پس منظر قانونِ عروج و زوال بھی ہے اور نیکی اور بدی کا باہمی تعلق بھی۔ اس مبحث میں بارہا سوچنے والوں کو مغالطے ہوئے، مگر قرآن کا قانون پوری طرح جان لینے کے بعد پوزیشن واضح ہو جاتی ہے۔

کیا رائے ہے اس تقابل میں آپ کی کہ ایک شخص رشوت، سمگلنگ، ملاوٹ، سُود، قمار، شراب فروشی چوری، ڈاکہ یا کسی اور بُری تدبیر سے اعلیٰ درجے کی بلڈنگ کھڑی کرتا ہے، کرائے پہ اس کی دکانیں لگی ہیں۔ درآمدی برآمدی کاروبار ہو رہا ہے، بچے اونچے اداروں میں تعلیم پا رہے ہیں، آسائشوں کے تمام اسباب بہم ہیں۔ دوسری طرف ایک شخص ہے جو سچی خدا پرستی کے جذبے سے ہر غلط ذریعۂ آمدنی اور غیر اخلاقی حرکت سے بچتا ہے، نتیجۃً ایک جھونپڑی یا کھولی میں رہتا ہے، ماحول غلیظ ہے۔ گھر میں صحتیں خراب رہتی ہیں۔ بچوں کی تعلیم کے راستے بند ہیں۔

بتایئے بہ حیثیت پیروِ اسلام کے آپ دونوں میں سے کس کو کیا سمجھیں گے؟ آیا اوّل الذکر آدمی کو خادمِ اسلام، محبِ رسولؐ، داعیٔ حق، نقیبِ غلبۂ اسلام، خوش اخلاق، اسلامی معنوں میں عروج یافتہ کہیں گے؟

بس یہی مثال افراد، گروہوں، جماعتوں اور اقوام سب میں کام کرتی ہے۔ ایک آدمی ظلم کی چکی میں پس رہا ہوتا ہے، مگر اپنی اس بے بسی میں بھی وہ اسلام کو محبوب ہوتا ہے۔ دوسرا آدمی ظلم اور گناہ کے ذریعے طرح طرح کے کمالات جمع کر کے بہت سے دوسرے لوگوں کی خدمت بھی انجام دینے لگ جاتا ہے، مگر وہ اس مقام پر پہنچ کر بھی خدا اور رسولؐ کا پسندیدہ کردار نہیں ہے۔

کیونکہ اس کے شان و شکوہ کی بنیاد ظلم اور گناہ اور مالِ حرام پر ہے۔

اب آیئے اس بارے میں بھی قرآن سے رہنمائی لیں:

مَنْ عَمِلَ صَالِحاً مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً۔

"کوئی مرد ہو یا عورت، جو کوئی بھی نیک عمل اختیار کرے گا۔ بشرطیکہ وہ صاحبِ ایمان ہو تو ہم اُسے پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے"۔

وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَإِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكاً

"اور جس کسی نے میرے ذکر سے اعراض کیا تو اس کے لیے تنگی کی زندگی ہوگی"۔

سوال یہ ہے کہ کیا ایمان اور عملِ صالح بجائے خود انسانی زندگی میں کوئی مثبت قدروقیمت نہیں پیدا کرتے؟ ضرور پیدا کرتے ہیں، مگر آپ جب نفع اور خسارے کا مفہوم ایمانی و اخلاقی دائرے سے باہر آکر مادی اصطلاحات میں معین کرتے ہیں تو بات چکر میں پڑجاتی ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ "دنیا میں عروج اور ترقی صرف اہلِ ایمان کی اجارہ داری تو نہیں"۔ مشرک اور بے دین قومیں بھی خوش حالی اور نفع اندوزی کا مزہ چکھ چکی ہیں، مگر دولت اور شائستگی یا جبر کیشی اور خیرخواہی کو متقابلاً دیکھیں کہ ان میں فرق ہے یا نہیں؟

آپ نے اس بارے میں اللہ کا وہ خاص قانون ضرور پڑھا ہوگا جس کی تین شقیں سورۂ بنی اسرائیل میں مذکور ہیں:

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَاۗءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ

جو کوئی حاضر دنیا میں فوری فائدہ حاصل کرنا چاہے (اور اس کے لیے کوشش کرے) تو ہم جس کو جتنا چاہیں جلدی جلدی دے دیتے ہیں، اور پھر اس کے لیے جہنم کو مقرر کردیتے ہیں۔

وَمَنْ أَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولٰۗئِكَ

كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ۔

اور جو کوئی طلب گار ہو، آخرت (کی کامیابی) کا اور اس کے لیے اتنی کوشش کرے جیسے اس کے لیے لازم ہے، اور وہ صاحبِ ایمان بھی ہو تو ایسے لوگوں کی کوششیں کامیاب ہوتی ہیں۔

كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ

اِن سب کو — اُس فریق کو بھی، اور اِس فریق کو بھی — ہم نوازتے رہتے ہیں۔

ایک طرف دُنیا پرست لوگوں کا مقدر بیان ہوا، پھر آخرت والوں کو، اور پھر دونوں کو سامنے رکھ کر یہ فرمایا کہ دونوں کو موقع دیا جاتا ہے ۔ اور دونوں کے لیے راستے کھلے ہیں، یعنی غلبہ و کامیابی کا چکر تو چلتا ہی رہے گا ۔ سوال یہ ہے کہ دُنیا پرست اور آخرت والوں کے درمیان دُنیا میں وہ فرق کیا ہے جس کی گواہی زمانہ اور تاریخ دیتے ہیں؟ وہ فرق یہ ہے کہ تصورِ آخرت رکھنے والا خدا پرست چند اعلیٰ اوصاف و اقدار سے آراستہ ہو کر بلند مرتبہ انسان بنتا ہے اور دوسری طرف دُنیا پرست ہوسِ زر کی میں پڑ کر حیوانیت و درندگی اختیار کرتا ہے۔

بعض لوگوں نے حقیقت کے متذکرہ دو تقابلی آیتوں پر اچھی طرح غور کیے بغیر یہ مفہوم اخذ کیا کہ جس کسی کی زندگی شاداب اور پُررونق نظر آئے، سمجھو کہ وہ ایماندار ہے اور "حیاتِ طیبہ" اسے بطور انعام قانونِ الٰہی کے تحت ملی ہے ۔ دوسری طرف اگر کسی کی گذر حالات کی تنگی میں ہو رہی ہے تو وہ ذکرِ الٰہی سے یا ایمان سے یا دین سے اعراض کرنے والا ہے۔

یہ مفہوم اگر لیا جائے تو قرآن کی ساری تعلیم ہی اُلٹ پلٹ ہو جاتی ہے ۔ اصل مشکل "حیاتِ طیبہ" اور "معیشتِ ضنکا" کو سمجھنے کی ہے ۔ حیاتِ طیبہ وہ ہے کہ جس میں ظاہری اسباب چاہے کم ہوں، مگر آدمی کا اخلاقی معیار بلند ہو، معاشرے میں اس کی نیکی کے مفید اثرات پڑتے ہوں، اسے اپنے دل میں اطمینان حاصل ہو کہ وہ خدا کے قریب ہے اور دولت اور خواہشات اور مروجات کی زنجیروں سے آزاد ہے ۔ اسی طرح "معیشتہً ضنکًا" کے معنی یہ ہیں کہ اسباب کی جامع فراوانی اور دولت کی کثرت ہو، مگر آدمی خود بھی ایسی بُرائیوں میں مبتلا ہو، اس کے گھر والے بھی ایسے بُرے خیالات و رسوم کا شکار ہوں ۔ اس کا حلقۂ ربط بھی دُنیا پرستی اور جسم پرستی میں مبتلا ہو، اخلاقی قدروں کی

چمک سے ساری فضا خالی ہو، دل اندر سے کھوکھلا ہو تو ایسی زندگی میں بڑی تکلیف دہ گھٹن پائی جاتی ہے۔

بالکل اسی طرح بات کو افراد کی سطح سے اُٹھا کر جماعتوں یا قوموں اور حکومتوں کی سطح پر لے جائیے۔ اس پس منظر کے ساتھ سوچیے کہ بروئے قرآن و احادیثِ صحیحہ کتنے ہی نبی ایسے گذرے کہ جن کے ساتھ کبھی دس پانچ اور کبھی دو ایک دینی ساتھی راہِ حق میں چلے، درآنحالیکہ معاشی طور پر کھانے کے لحاظ سے فاقہ مستی اور پوشش کے لحاظ سے پھٹے پُرانے کپڑوں میں گذران کی۔ بعض انبیاء کو تو ایک بھی رفیق نہیں ملا۔ دوسری طرف نمرود اور فرعون اور شداد اور ان کے فوجی اور سول افسروں کے وہ ٹھاٹھ تھے کہ اگر دولت و خوشحالی ہی علامتِ فلاح ہے تو پھر فلاح ہی فلاح ہے۔ آخر کیا خلاصہ نکلا قانونِ عروج و زوال کا؟

میرا خیال ہے کہ ہمارے بزرگ بھائی ایک بار پھر سارے معاملے پر غور کریں۔

—— تحریکی مکتبوں میں ایک گراں قدر اضافہ ——!

—— کارکنوں کی قوتِ خرید کے اندر فراہمی کتب کا ایک منصوبہ ——!

—— شہر کے وسط میں ایک نیا مکتبہ ——!

مکتبۂ الکوثر

—— دعوتی کتابچے نصف قیمت پر اور دیگر کئی رعایتی اسکیمیں

—— تحریکی کتابوں کا بیش بہا ذخیرہ —— آیئے اور حاصل کیجیے!

اوقاتِ کار :- روزانہ ۳ بجے دن تا ۹ بجے شب (سوائے تعطیلات)

پتہ

دفتر جماعتِ اسلامی ضلع شرقی - ۲۱۱۶ - پی - آئی - بی کالونی سارٹن روڈ کراچی ۵

فون نمبر:- ۴۲۲۷۲۶